اسلام اور عصر حاضر کے تقاضے

علما کے سیمینار کی روئداد

"محکمۂ اوقاف مغربی پاکستان کی دعوت پر لاہور میں ۲۴ سے ۲۷ اگست ۱۹۶۹ء تک علمائے کرام کا چار روزہ اجتماع ہوا جس میں "اسلام اور عصرِ حاضر کے تقاضے" کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ اس سیمینار میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں ہوئیں اور مقالات پڑھے گئے۔ یہاں اس سیمینار کی مختصر روئداد پیش کی جاتی ہے۔"

علما سیمینار کی مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری مولانا مناظر حسین نظر نائب ناظم مساجد اوقاف نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں سیمینار کے انعقاد کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے علمائے کرام کی توجہ خاص طور سے اس طرف مبذول کرائی کہ آخر تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ہم مسلمان کمزور اور مغلوب کیوں ہیں۔ "کیا ہمارے پاس مادّی وسائل کا فقدان ہے یا دولتِ ایمان کی کمی ہے؟ یا یوں کہا جائے کہ دونوں کی کمی ہے۔" بہرحال یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہم ترقی کی دوڑ میں دنیا کی دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہیں اور ہمیں ہر معاملے میں ان سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سیکرٹری مجلس استقبالیہ نے بتایا کہ ہمیں ان امور پر غور کرنا اور اس سلسلے میں جن مسائل سے ہمیں دوچار ہونا پڑ رہا ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنا اور اسے عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ہے۔

اس سلسلے میں پہلے محکمۂ اوقاف کے زیر اہتمام ایک سیمینار پشاور میں ہوا تھا۔ اس سے جو مفید عملی نتائج نکلے، سیکرٹری موصوف نے ان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ پشاور سیمینار سے ایک راستہ یہ بھی کھلا کہ اس علاقے میں علما نے امداد باہمی کے اصول پر کچھ مراکز قائم کیے۔ ان مراکز میں ائمہ، خطبا اور علما نے دیہی امور میں تربیت حاصل کی۔ عملی کاموں میں پورا حصہ لیا۔ یہاں تک کہ کھاد وغیرہ کی تقسیم کا کام علما نے اپنے ذرائع سے کرایا۔ (اس طرح) اس علاقے میں کسی جگہ کھاد کی بلیک نہ ہو سکی۔ بعض علما نے مرغ بانی کی

بھی تعلیم حاصل کی ......" اس سے ایک تو یہ غرض تھی کہ خود خطبا اور علما کی معاشی حالت بہتر ہو۔ اور دوسرے وہ دیہی عوام کی اس قسم کے ترقیاتی کاموں میں رہنمائی کریں۔ اور اس طرح ملک بحیثیت مجموعی ترقی کرے۔

سیکرٹری صاحب نے اپنے خطبہ میں خاص طور پر اس بات پر زور دیا:

"قرآن ہمیں ایمان اور خدا پر کامل اذعان و یقین کا بھی حکم دیتا ہے، اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مادی اور ظاہری وسائل مہیا کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔"

محکمۂ اوقاف کے ناظم اعلیٰ جناب محمد مسعود صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں قومی و ملی زندگی کی تعمیر نو میں علما و خطبا جو اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، اس کی نشاندہی کی۔ نیز یہ بتایا کہ مملکت پاکستان اس وقت اپنی تاریخ کے ایک نہایت ہی نازک موڑ سے گزر رہی ہے، اور اس میں اسے علمائے کرام کی رہنمائی اور عملی مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اس ضمن میں موصوف نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا:

"..... جب تک عوام کی اصلاح نہیں ہوتی، ہماری قوم کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین ہو گیا ہے کہ عوام کی اصلاح کا کام علما اور صرف علما ہی کر سکتے ہیں۔"

یورپی ملکوں میں باوجود اتنی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے مذہبی سرگرمیاں بدستور جاری ہیں، اور وہاں گرجے موجود ہیں اور پہلے سے زیادہ اجتماعی زندگی میں مؤثر ہیں۔ اسی طرح ان یورپی ملکوں میں پادری حسب سابق اپنا کام کرتے ہیں، اور ان کے خلاف عوام میں کوئی عناد کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ان کی پہلے کی طرح عزت کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس روس اور چین میں مذہبی طبقوں کا اثر ختم کیا جا رہا ہے، اور معاشرے میں ان کی پہلے کی سی حیثیت نہیں رہی۔ آخر یہ کیوں ہے؟ ناظم اعلیٰ اوقاف نے اس کی وضاحت یوں کی:

"میں یورپ کے ملکوں میں گھوما ہوں۔ میں ان کے دیہات اور قصبوں میں گیا۔ میں وہاں کے پادریوں سے ملا۔ ان کے گرجوں کو جا کر دیکھا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ باوجود اتنی صنعتی و معاشی ترقی کے ان ملکوں میں اب تک گرجے ہیں، پادری ہیں، اور عوام میں ان کا اثر ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ پادری مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی حاصل کرتے ہیں۔ ان کی علمی و ذہنی سطح ان کے پاس آنے والوں سے اونچی ہوتی ہے۔ پھر وہ معاشرتی بہبود کے کام کرتے ہیں۔ لوگوں کے دکھ درد میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک حد تک فارغ البال ہیں، اور اپنی روزی کے لیے ان کو لوگوں کے ہاتھوں کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا، بلکہ کلیسیائی نظام

ان کی تمام ضروریات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔"

اس کے برعکس مذہبی طبقوں کے ساتھ روس و چین میں کیا ہوا؟ ناظم اعلیٰ اوقاف نے اپنے خطبہ صدارت میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "میں روس اور چین بھی گیا، اور ان دونوں ملکوں میں پادریوں اور مذہبی لوگوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا، اس کے اسباب معلوم کرنے کی بھی کوشش کی۔ برطانیہ، ہالینڈ، ناروے اور دوسرے یورپی ملکوں میں پادری سماج کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ وہاں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ سماج کی خدمت کرتا ہے اور سماج کو اس کی ضرورت ہے۔"

ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں بھی پادریوں کے ایک گروہ نے سماج کی بڑھتی ہوئی قوتوں کی مخالفت کی اور وہ عوام کی ترقی میں سدِ راہ ہوا، لیکن اسی زمانے میں خود عیسائیت کے اندر اصلاح کی تحریکیں اٹھیں، جن کے نتیجہ میں پادریوں نے اپنے آپ کو معاشرے کا ایک صالح اور مفید عنصر بنا لیا۔ اور وہ بجائے اپنی قوم کی ترقی میں رکاوٹ بننے کے اس میں ممد و معاون ہو گئے۔ چونکہ روس و چین میں ایسا نہیں ہوا، اور وہاں کے مذہبی طبقوں نے اپنے عوام کی ضرورتوں اور زمانے کے تقاضوں کا خیال نہ رکھا اس لیے نئے سماج میں انھیں کوئی مقام نہیں دیا گیا۔

محمد مسعود صاحب نے اُن عظیم "فتنوں" کا بھی ذکر کیا جن سے آج پوری ملتِ اسلامیہ کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ آپ نے کہا:

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یورپ، امریکہ، روس اور چین سے ایک سیلاب کی شکل میں نئے افکار آ رہے ہیں۔ ان افکار کے ساتھ نئی تہذیب، نئی معاشرت، نئی معیشت، بلکہ زندگی کے تمام نئے رنگ ڈھنگ ہم پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔"

موصوف نے کہا کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ ایک بہت خطرہ ہے، اور اس کی روک تھام کرنا بہت ضروری ہے، اور یہ کام علما ہی کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے پہلے تاریخ میں مسلمانوں کو ایک سے زیادہ بار اس طرح کے خطرات کا سامنا کرنا پڑا، اور وہ ان پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔

ناظم اعلیٰ نے اس کی یہ دو مثالیں دیں:

"عباسی خلافت کے شروع میں یونانی افکار اور قدیم مجوسی تہذیب اسی طرح ملتِ اسلامی پر حملہ آور ہوئی تھی، جیسے اس عہد میں اِن ملکوں کے افکار اور تہذیبیں حملہ آور ہو رہی ہیں۔ اس کے بعد چنگیز خاں، ہلاکو اور ان کے جانشینوں نے پوری اسلامی دنیا کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور ڈر پیدا ہو گیا کہ اسلامی تہذیب کے ساتھ خدانخواستہ کہیں اسلام بھی خون

اور آگ کے اس سیلاب میں نہ بہہ جائے، لیکن تاریخ نے دیکھا:

((پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے))

یہ کیسے ہوا؟ مسعود صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ سب علمائے کرام، حکمائے اسلام اور صوفیائے عظام کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ خود ان کے الفاظ میں:

"عباسی عہد میں ہمارے ان بزرگوں نے یونانی فلسفہ کا رد اس سے بہتر اسلامی فلسفہ سے کیا۔ انھوں نے منطق و فلسفہ پڑھا، اور علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔ اور اس طرح ذہنی و علمی لحاظ سے بلند مقام پر پہنچ کر یونانیت پرستوں کو زک دی۔"

"تاتاریوں کی درندگی، سفاکی اور ہلاکت انگیزی کا تریاق یہ تھا کہ وحشی اور خونخوار تاتاری جب مسلمان علماء و صوفیہ سے ملے تو انھیں اخلاقی، دینی اور تہذیبی سطح پر اتنا اونچا پایا کہ وہ ان کی طرف کھنچ گئے اور اسلام قبول کیے بغیر ان کے لیے چارہ نہ رہا۔"

ناظم اعلیٰ اوقاف نے علما سے اپیل کی کہ وہ قوم و ملت کی اصلاح، ترقی اور فلاح و بہبود اور مملکت پاکستان کے استحکام میں فعال حصہ لیں، اور ان کا آج تاریخ بنانے میں وہی رول ہو، جو مسلمانوں کی تاریخ کے زریں دور میں تھا۔ وہ اس وقت ملت کی اگلی صفوں میں ہوتے تھے......

مسعود صاحب نے علما سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ فرقہ واریت سے بلند ہو کر تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کریں۔ اور یہ کہ پاکستان کے لیے، جس کی کہ اساس ہی اسلام ہے، اتحاد بین المسلمین بہت ہی ضروری ہے۔ آخر میں موصوف نے اپنا خطبۂ صدارت ان الفاظ پر ختم کیا:

"اسلام بے شک پوری زندگی پر حاوی ہے، اور ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں اسلام سے رہنمائی لینی چاہیے۔ لیکن میں بہ ادب یہ کہوں گا کہ خدا کے لیے اسلام جیسے ابدی و ازلی اور عالمگیر دین کو تنگ قسم کی پارٹی سیاست کا مرادف نہ بنائیے کُل کُل ہوتا ہے اور جزو جزو، جزو کو کُل بنا دینا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس سے ڈر یہ ہے کہ کہیں خدانخواستہ اسلام کو کوئی گزند نہ پہنچے۔"

سیمینار کا افتتاح ۴ راگست کو صبح نو بجے ہوا۔ اس دن سہ پہر کو حضرات مدعوئین کو لاہور کے اہم تاریخی مقامات دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ دوسرے دنوں میں وہ بڑے بڑے صنعتی مراکز دیکھنے تشریف لے گئے۔ اور انھوں نے جدید ترین مشینوں کو کام کرتے ملاحظہ فرمایا۔ حضرات علما نے واہگہ

کا میدان کارزار اور شہدا کی یادگاریں بھی دیکھیں۔

۲۵ ر ۲۶ راگست کو سیمینار میں جو مقالات پڑھے گئے، ان کا مختصر خلاصہ درج ذیل ہے:

(جناب ایم۔ اے خاں داو۔ ایس۔ ڈی اوقاف (۱۹۵۰ء) سے محکمۂ اوقاف سے متعلق ہیں۔ ۱۹۵۸ء کو ایک آرڈی ننس کے ذریعہ بڑے بڑے مزاروں کو محکمۂ اوقاف کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس سے پہلے ان مزاروں کی کیا حالت تھی، اور وہاں کیا ہوتا تھا، موصوف ان امور سے سب سے زیادہ باخبر ہیں۔ آپ نے اپنے مقالے میں محکمہ کی سرگرمیوں کا ایک سرسری خاکہ پیش کیا۔ آپ نے اس سلسلے میں دربار داتا گنج بخش صاحب کی مثال دی۔ جب سے اس کا انتظام محکمہ اوقاف کے پاس آیا ہے، اس نے مزار پاک کے اردگرد کے علاقے کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ نیز دربار داتا صاحب کی آمدنی اسلام کی خدمت اور رفاہ عامہ کے لیے کس طرح خرچ ہو رہی ہے، اس کا بھی سب کو علم ہے۔ لیکن یہی آمدنی تقریباً آٹھ صدیوں تک مجاوروں کو ملتی رہی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ انھوں نے اس آمدنی سے رفاہ عامہ کے کام تو الگ رہے، کیا دربار داتا صاحب کو بھی کبھی ٹھیک رکھا؟

ایم۔ اے خاں صاحب کے الفاظ میں اس سوال کا "مجھے یقین ہے، شرمندگی سے جھکے ہوئے سر کے سوا کچھ جواب نہ مل سکے گا۔"

(جامعہ مدنیہ لاہور کے مہتمم مولانا حامد میاں کا مقالہ "محنت اور کسب حلال کی اہمیت" پر تھا۔ آپ نے بتایا کہ اسلام نے کسب حلال اور اپنی محنت سے کمانے پر بہت زور دیا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے "حلال کی کمائی کی طلب کرنی مسلمانوں پر فرض کے بعد دوسرا فرض ہے۔" یعنی اگر پہلا فرض صحیح عقائد و عبادات ہیں تو دوسرا کسب حلال ہے۔ کیونکہ بغیر کمائے نظام معاش انسانی نہیں چل سکتا۔ اور حلال کی کمائی ہی تقویٰ اور طہارت کی بنیاد ہے۔ مولانا نے اس امر کی وضاحت کے لیے تاریخ اسلام سے بہت سی مثالیں دیں۔ اور آخر میں کہا کہ اہل اللہ اپنی محنت کی کمائی سے زندگی گزارتے تھے۔

کمانڈنٹ سول ڈیفنس اکیڈمی لاہور جناب حشمت علی صاحب نے جنگ میں شہری دفاع کی اہمیت پر مقالہ پڑھا، اور آج کل کی جنگوں میں شہری آبادی کو جس طرح اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے، اس سے علمائے کرام کو متعارف کرایا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ عوام کو شہری دفاع کی اہمیت کا احساس دلائیں۔

جناب پروفیسر علم الدین سالک صاحب کے مقالے کا عنوان تھا "مرد مومن تاریخ کے آئینے میں"

آپ نے اسلام کے صدر اول کے واقعات بیان کیے اور اس ضمن میں مردِ مومن کے کچھ خصائص معین فرمائے۔

"تسخیر کائنات اور اسلام" پر مولانا محمد یوسف بنوری مہتمم مدرسہ نیو ٹاؤن کراچی نے اپنا مقالہ پڑھا۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن حکیم کا مقصدِ اصلی انسانیت کی تکمیل ہے "یعنی انسان کو درندوں اور حیوانات کی صف سے نکالا جائے اور اس کی ایسی تربیت کی جائے اور ایسے اعلیٰ مکارم اخلاق سے آراستہ کیا جائے کہ وہ دنیا میں باعزت اور پرُسکون زندگی سے سرفراز ہو سکے اور اس عظیم الشان محیر العقول کارخانۂ قدرت کے خالق و مالک کی خوشنودی حاصل کر سکے۔"

قرآن حکیم کا مقصدِ حقیقی چونکہ یہ ہے، اس لیے اس میں اگر مظاہر قدرت اور آثار قدرت کا بیان ہے۔ یا تاریخی حقائق کا ذکر ہے، تو اس سے غرض اسی مقصدِ حقیقی کی تائید ہے، طبیعیات یا تاریخ کو بیان کرنا نہیں۔ خود مولانا بنوری صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

"قرآن کریم نہ تاریخی کتاب ہے کہ محض واقعات کی تفصیل ہی بیان کرتا رہے، اور نہ ہی طبعی نوامیس کی تفصیل پر مشتمل کتاب طبیعیات ہے کہ محض علمی اور ذہنی عیاشی کے افسانوں میں وقت ضائع کرے۔ وہ تاریخ کی روح پیش کرتا ہے اور طبیعیات کے فکر و عمل کے نتائج بیان کرتا ہے جس سے توحید الٰہی، خلق و ربوبیت کے حقائق انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اور روح کو پاکیزگی حاصل ہو تاکہ وہ نظام عالم میں خلیفۃ اللہ کے منصب اعلیٰ کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن جائے۔"

بے شک قرآن مجید مظاہر قدرت میں غور و تدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے لیکن اس سے اس کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی ذہن و فکر کے سامنے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ کھل جائے اور اس غور و فکر کے بصیرت آموز نتائج سے ایمان بالغیب کی تائید اور پرورش ہو۔ اس لیے کہ ان حقائق کونیہ اور حقائق الٰہیہ میں غور و خوض سے ایمان قوی ہو گا۔"

قرآن مجید یقیناً حقائق کونیہ میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مولانا بنوری فرماتے ہیں :

"وہ ان کی طرف محض علم و فن کی حیثیت سے کبھی دعوت نہیں دیتا کہ محض فن ہی کو مقصد بنا لیا جائے۔"

سائنس نے جو اس زمانے میں معجزات کر دکھائے ہیں، اور انسان چاند میں پہنچ گیا ہے، مولانا بنوری صاحب نے اپنے خطبے میں ان فتوحات کا خیر مقدم کیا ہے۔ فرماتے ہیں : "..... ان چیزوں کو دیکھ کر سائنسدانوں

کے کمالات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ..... بلاشبہ عقل کی یہ ترقی اور کائناتی فضا میں رسائی فوق العادۃ ترقی ہے کہ ایک مشینی ایجاد یعنی خلائی جہاز اور قمری گاڑی کو لاکھوں میل فضا پر پہنچا دینا اور پھر لاکھوں میل کے فاصلے سے زمین کے ساتھ اس کا ربط قائم رکھنا اور زمین پر سائنس دانوں کا اس پر کنٹرول کرنا، ہر خرابی کی اصلاح کرنا اور ہر سیکنڈ پر اس کی کیفیت سے باخبر رہنا اور زمین پر اس کی مختلف کیفیات کی تصویروں کا پہنچتے رہنا وغیرہ وغیرہ نہایت ہی حیرت افزا انسانی ترقی ہے۔"

عقل کی اس اعجاز فرمائی کا اعتراف درحقیقت اللہ تعالیٰ کے کمال خالقیت کا اعتراف ہے، اور اس سے اس کی عظمت وجلال پر ایمان میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ باقی ہیئت کے نظام بطلیموسی کو اسلامی قرار دینا صحیح نہ تھا، اب اگر جدید طبعیات نے بطلیموس کے قدیم نظام ہیئت کو غلط ثابت کر دیا ہے تو اس سے اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اس بارے میں مولانا بنوری صاحب کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

"..... عوام یا خواص نے غلطی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ شاید اسلام بھی وہی کچھ کہتا ہے، جو ہیئت افلاک کے قدیم نظریات میں بیان کیا گیا ہے۔ جب قدیم نظریات غلط ثابت ہوئے تو لوگوں کے اعتقاد ڈگمگانے لگے۔ جیسے طبعیات کی ان جدید تحقیقات نے اسلام کے پیش کردہ حقائق کو غلط ثابت کر دیا ہو۔"

مولانا فرماتے ہیں: "لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان نظامات سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ الحمدللہ اسلام اپنی جگہ پر قائم ہے، قدیم نظریۂ ہیئت غلط ثابت ہو یا جدید۔"

مولانا بنوری صاحب نے اس امر کا اثبات ضرور کیا،

"سائنس کا یہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہے کہ آسمان کا وجود نہیں ہے۔"

مختصراً مولانا نے اپنے خطبے میں یہ حقیقت واقعی واضح طور پر بیان فرمائی کہ

"قرآن کریم اور وحی الٰہی کا منصب ان حقائق کو بیان کرنا ہے، جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی۔ عقل کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے نبوت اور وحی کی حد شروع ہوتی ہے۔ قرآن کریم اگر ان حقائق کائنات کی طرف کبھی کبھی اشارہ کرتا ہے تو اس کا مقصد محض تذکیر وموعظت ہے، یا صرف ان عقیدوں کی گرہ کشائی ہے، جہاں عقل انسانی کو ٹھوکر لگتی ہے اور اس کی بصیرت گرہ کھاتی ہے۔"

اور یوں مولانا کے نزدیک "قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ تصریح نہیں کی گئی کہ یہ چاند، سورج، افلاک میں

جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو صرف بطلیموسی ہیئت کی پیداوار ہے کہ سبع سیارات آسمان میں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس سلسلے میں مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے اپنے استاد حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی یہ رائے نقل کی۔ مولانا بنوری نے اپنے خطبے میں کہا:

"ہمارے استاد محترم حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیری نے اپنے ایک فصیح وبلیغ قصیدہ میں اس حقیقت کا پہلی بار انکشاف فرمایا ہے کہ عالم اسباب میں عقل انسانی کی اختراعات کے ذریعہ جتنی حیرت انگیز ایجادات ہیں اور ہوں گی، ان سب کا نمونہ انبیائے کرام کے معجزات میں موجود ہے۔ درحقیقت انبیائے کرام کے معجزات پیش خیمہ ہیں اس بات کا کہ آئندہ چل کر نسل انسانی اسباب کے ذریعہ یہاں تک ترقی کرے گی۔ فرماتے ہیں:

وقد قیل ان المعجزات تقدمت بما یرتقی فیہ الخلیفۃ فی مدی

"اسلام کی دعوتِ فکر" پر مولانا تجمل سلیمی صاحب نے مقالہ پڑھا۔ آپ نے بتایا: "قرآن حکیم نے اپنے مخاطبین کو غور وفکر کرنے کی دعوت دی، اور فرسودہ اوہام کی بیخ کنی اور تقلید پرستی کی پُرزور مذمت کر کے نوع انسانی کو فطرت کے عظیم عطیہ" ذہن "سے مستفید ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔"

قرآن مجید نے تدبر وتفکر پر کس قدر زور دیا ہے، مولانا سلیمی صاحب نے فرمایا:

"قرآن حکیم کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام اللہ کا ایک چوتھائی سے زیادہ حصہ بالواسطہ یا بلاواسطہ غور وفکر کے احکامات پر مشتمل ہے۔" اس نے مختلف پیرایوں میں فطرت اور اس کے ہر دم متغیر مظاہر پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ اسی طرح رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات گرامی سے بھی تفکر وتدبر کی فضیلت آشکارا ہوتی ہے۔

قرآن وحدیث کے اقتباسات دینے کے بعد مولانا موصوف نے بتایا: "ان سے یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ اسلام کی بنیاد ہی دعوتِ فکر پر ہے۔

مولانا امین الحق صاحب ڈسٹرکٹ خطیب شیخوپورہ کے مقالہ کا موضوع تھا "اسلام کا معاشی نظام"۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کی امتیازی حیثیت کو مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

"اسلامی نظام معاش اشتراکیت اور سرمایہ داری نظام کے درمیان معتدل نظام ہے۔ اس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے، اس کے اپنے اصول ونظریات ہیں۔ اس کی منصفانہ حدود ہیں، جن سے تجاوز کرنے کو وہ کسی

فرد یا جماعت کے لیے روا نہیں رکھتا۔ نہ فرد کی سرمایہ داری کو پسند کرتا ہے اور نہ جماعت کی سرمایہ داری کو مقصدِ حیات قرار دیتا ہے۔۔۔۔۔"

سرمایہ داری سے اسلامی نظامِ معاش کا اختلاف یہ ہے کہ سرمایہ داری میں ہر طرح سے دولت کمانے کی آزادی ہے، اور اسلام نے صرف حلال طریقے سے کمانے کی شرط رکھی ہے، اور اشتراکیت سے وہ اس لیے الگ ہے کہ اشتراکیت انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتی، اور اسلام صرف اس کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کا احترام کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا موصوف کے الفاظ میں: "قرآن شریف کسی فرد یا جماعت کو معیشت کے نظام پر قابض ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔"

مولانا امین الحق صاحب نے اس امر کی صراحت کی کہ 'اسلام جائز دولت اور سرمایہ کا روادار ہے۔۔۔۔۔ مگر اس کے ساتھ نفسِ معیشت میں بنی نوع انسان کے ہر ایک فرد کو مساوی حق دیتا ہے اور کسی انسانی فرد کو نفسِ معیشت کے حق سے محروم رکھنے کا روادار نہیں ہے۔" اس سلسلے میں انھوں نے حافظ ابن حزم کی کتاب "المحلی" سے یہ عبارت پیش کی:

"ایک بستی کے دولت مندوں پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ فقرا کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں، اور سلطان دولت مندوں کو فقرا کی معاشی زندگی کی کفالت کے لیے مجبور کرے۔۔۔۔۔ اسبابِ زندگی میں کم از کم اتنا انتظام ضروری ہے کہ ان کے لیے ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو۔ اور سردی اور گرمی دونوں موسموں کے لحاظ سے گرمی سردی کا لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب سے محفوظ رکھے۔"

آیت "خلق لکم ما فی الارض جمیعا" کے ذیل میں مولانا موصوف نے کہا: لکم میں لام تعلیل اور انتفاع کے لیے ہے۔ تمام زمین کی تمام اشیا تمھارے انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ کل زمین کل افرادِ انسانی کے انتفاع کے لیے ہے۔ اگرچہ بعض زمین کسی وجہ سے بلحاظ ملک اور بلحاظ انتفاع کسی کے لیے مخصوص ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔"

مولانا امین الحق صاحب نے اپنی اس وضاحت کی تائید میں حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "ایضاح الادلہ" سے یہ اقتباس پیش کیا:

"جملہ اشیائے عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان خلق لکم ما فی الارض جمیعاً تمام بنی آدم کی مملوکہ معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی غرض خداوندی تمام اشیا کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس ہے، اور کوئی شئے فی حد ذاتہ کسی کی

ملوک خاص نہیں بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترک ہے، اور من وجہ سب کی ملکیت ہے۔ اور بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا ہے۔ اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی ہے اس وقت تک کوئی اور اس میں دست اندازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک اور قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ کرے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے۔ کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے متعلق ہو رہے ہیں"

بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے "عسکری تنظیم اور اسلام" پر مقالہ پڑھا۔ مولانا محمد بخش مسلم خطیب مسلم مسجد لاہور نے حدیث نبوی " کاد الفقر ان یکون کفرا " کو اپنے مقالہ کا موضوع بنایا۔ اور اس کی تشریح کرتے ہوئے آخر میں کہا: " حالات کا تقاضا، زمانہ کی پکار یہی ہے کہ ہم اپنی اقتصادی حالت کو بہتر، برتر اور خوش تر بنانے کے لیے انتہائی جدوجہد سے کام لیں اور سمجھ لیں کہ افلاس اور محتاجگی انسان کو واقعی کفر اور کفران نعمت کی جانب لے جانے والی بلائیں ہیں ......" ڈاکٹر خالد غزنوی ایم۔بی بی ایس نے اپنے مقالے " اسلام ایک سائنسی حقیقت " میں بتایا اور اس بارے میں مثالیں دیں کہ " اسلام ہی دنیا کا واحد سائنٹفک یعنی دین فطرت ہے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اگر سائنسدان گہری نظر سے قرآن وحدیث کا مطالعہ فرمائیں تو رموز کائنات کی بہت سی گتھیوں کا سلجھانا ان کے لیے آسان ہو جائے گا۔"

جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے استاذ فقہ و قانون مولانا حسن الدین ہاشمی صاحب نے " اسلام کا نظام مدارس " کے عنوان پر مقالہ پڑھا۔ آپ نے بتایا کہ اسلام ایک انقلابی اور ترقی پسند مذہب ہے جو جمود کو توڑ کر اپنے پیروکاروں کو زندگی کی دوڑ میں نہ صرف یہ کہ آگے بڑھنا سکھاتا ہے بلکہ انھیں یہ سبق بھی دیتا ہے کہ باقی دنیا کی رہبری بھی تمھارے ذمے ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کی بہبود کے لیے بھیجا گیا ہے)۔ اس رہبری کے لیے زیور علم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے ابتدائے اسلام ہی سے تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ......" صاحب موصوف نے بتایا کہ شروع میں مساجد ہی تعلیمی مرکز تھیں۔ بعد میں باقاعدہ مدارس اور جامعات قائم ہوئیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض مشہور قدیم تاریخی مدارس کا ذکر کیا اور آخر میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے قیام کو اس ملک میں ایک نیا تعلیمی اقدام قرار دیا۔

جناب غلام مرتضیٰ شاکر ترک نے اپنے مقالے میں مسجدوں سے معاشرتی اصلاح کا کام لینے کی طرف

توجہ دلائی۔ آپ نے بتایا کہ پہلے کی طرح اب بھی صحت و صفائی، تعلیم و تربیت اور بدعات کے خاتمے کے ضمن میں مسجد فعال ادارے کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

سیمینار میں بعض اور مقالے بھی پڑھے گئے، لیکن چونکہ ان کا براہ راست تعلق سیمینار کے موضوع سے نہ تھا، اس لیے ان کا یہاں ذکر نہیں کیا جاتا۔

یہ سیمینار ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اس میں مغربی پاکستان کے ہر حصے کے مشہور علما نے شرکت کی۔ محکمہ اوقاف کی انتظامیہ سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور انتظامیہ نے علمائے کرام کے مفید مشوروں سے استفادہ کیا۔

سیمینار کے چار دنوں میں جس طرح مختلف مکاتبِ خیال سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام ایک دوسرے سے ملتے رہے، ان میں آپس میں تبادلہ خیال ہوتا رہا، اور پھر انھوں نے مختلف موضوعات پر مقالات پڑھے اور سنے، اگر باہمی ربط وضبط اور افہام وتفہیم کا یہ دائرہ اور وسیع ہو جائے۔ قومی زندگی کی اصلاح و ترقی میں بھی ہمارے علما، اس طرح باہم تعاون کریں اور تعمیری کاموں میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں تو اس ملک کے دن بہت جلد بدل سکتے ہیں۔ ہمارے علما ایک بہت بڑی عوامی طاقت ہیں۔ عوام کے ہر طبقے تک ان کی پہنچ ہے۔ اور عوام پر ان کا بڑا اثر ہے۔ اس ملت کی بہت بڑی خوش قسمتی ہو گی اگر علما کی یہ عوامی طاقت عوام کی فلاح و بہبود، ان کی تعمیر و ترقی، ان کو مکارم اخلاق سکھانے اور انھیں اپنی حالت بہتر بنانے میں صرف ہو۔

محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام ہونے والے یہ سیمینار علمائے کرام کی توجہ کو ملک و ملت کی ان ضرورتوں کی طرف مبذول کرانے میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے موجودہ دور میں علما کو ایک مثبت اور فعال کردار ادا کرنا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے سیمیناروں سے عصر حاضر کے تقاضوں اور ملک وملت کی ضرورتوں سے واقف ہوں۔